۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۴

رجسٹرڈ نمبر ۹۲۲ - ایل
فون نمبر — ۲۹

ایڈیٹر
آل احمد سرور

فی کاپی بیس پیسے
قیمت سالانہ ۶ روپے

اشاعت کی تاریخیں
[illegible]

اداریہ

یوم جمہوریت

۲۶ جنوری کو ہماری جمہوریت بائیس سال کی ہوجائے گی اور ۱۵ اگست کو ہماری آزادی کو پچیس سال ہوجائیں گے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟

یوم جمہوریت محض ایک دن ہی نہیں، ایک علامت ایک نشان بھی ہے۔ ہم بجا طور پر اس موقع پر خوشی مناتے ہیں مگر خوشی منانا کافی نہیں۔ ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس دن، اس علامت، اس نشان کی معنویت کو سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ جمہوریت اس دور کی آواز ہے، جمہوریت کی کوئی شکل ہو، ساری دنیا اس لفظ کو عزیز رکھتی ہے اور اپنی تاریخ، اپنے ماحول اور اپنے مسائل کے مطابق اس لفظ کو معنی عطا کرتی ہے۔ یہ زمانہ فوجی حکومتوں یا آمرانہ حکومتوں کا نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ فوجی یا آمرانہ حکومتیں بھی جمہوریت کا نام لینا ضروری سمجھتی ہیں۔ ہم نے جب جمہوریت کو اپنایا تو ایک بہت بڑی ذمہ داری قبول کی۔ ہم نے یہ تسلیم کرلیا کہ ہمارے ملک میں مساوات ہوگی، افراد کو ان کا حق ملے گا، سارے مسائل بحث اور افہام و تفہیم سے طے ہوں گے، سماجی اونچ نیچ کم ہوگی اور جمہوری ادارے ملک کے تمام کاموں کو چلائیں گے چونکہ ہمارے ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں اس لئے یہ بھی طے کیا گیا کہ مذہب کی بنا پر سیاسی و سماجی کاموں میں اور قومی زندگی کے کاروبار میں امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ جب ایک بڑی اکثریت ایک مذہب کی ماننے والی ہو تو یہ خطرہ رہتا ہے کہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ انصاف نہ ہوسکے اس لئے دستور میں اس کی وضاحت کی گئی کہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق ترقی کے مواقع ملیں گے، یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ بعض اوقات اس اصول پر قرار واقعی عمل نہیں ہوتا اور مذہب کی بنا پر کچھ لوگوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے مگر اصول صحیح ہے اور ہم سب کا فرض ہے کہ اس اصول کو حرز جاں بنائیں اور صرف وظیفۂ لب نہ سمجھیں۔ سیکولرزم کی راہ پر چلنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری تو اکثریت کی ہے، مگر اقلیت کو بھی یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ ہر کوتاہی کی وجہ مذہبی تعصب نہ سمجھے اور اکثریت کے جذبات و خیالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے کوئی دستور کتنا ہی اچھا ہو اس پر عمل قوم کے اخلاقی معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ چونکہ عمومی طور پر ہمارا اخلاقی معیار بلند نہیں ہے اور تاریخ کی غلط تدریس، ماضی کے واقعات اور مذہب کی روح کے بجائے اس کے رسمی پہلو پر زور کی وجہ سے اکثریت کا عمل بھی بعض اوقات سیکولر نہیں ہوتا اور اقلیت کے کچھ افراد بھی بعض اوقات علیحدگی پسندی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں، اس لئے آج بھی سیکولرزم عام نہیں ہوسکا ہے۔ مگر ہمارا اصول صحیح ہے اور اسی میں ہماری نجات ہے اس لئے اس کو عام زندگی میں جاری و ساری کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے، اسی طرح

لسانی اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ ریاستوں کی تنظیم نو کمیشن نے لسانی ریاستوں کی تنظیم کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر زور دیا تھا کہ لسانی اقلیتوں کی پاسداری اور ان کے حقوق کا لحاظ ضروری ہے، مگر ابھی تک اکثریت نے اپنے نشے کی وجہ سے یا زبان کے غلط تصور کی وجہ سے یا اپنی برتری سب سے منوانے کے جذبے سے سرشار ہو کر، لسانی اقلیتوں کے جائز مطالبات کو جو ریاستی حکومتیں بھی تسلیم کر چکی ہیں، عملاً پورا نہیں کیا۔ اس لئے یوم جمہوریت کے موقع پر خوشی منانے کے علاوہ ہمیں ذرا اپنے گریبان میں منہ بھی ڈالنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہم میں سے ہر ایک نے کس حد تک پچھلے سال جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی منزل کو اپنایا اور اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ حکومت یا اکثریت نے کس حد تک اپنے فرض کے انجام دینے میں کوتاہی کی اور اسے یہ فرض یاد دلانا چاہیے۔ ہماری جمہوریت نے حال کے بحران میں جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، جس طرح بنگلہ دیش کو آزاد کرایا ہے اور ہندوستان کی سرحد سے ہر خطرے کو دور کر دیا ہے، اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ یہ کامیابی گو ہمارے جوانوں کی اور ہماری قیادت کی بھی ہے، مگر اصل کامیابی ہمارے اصولوں کی ہے۔ ان اصولوں کو دلوں میں جگہ دینا اور ان پر پوری طرح عام زندگی میں عمل کرانا، سبھی کی ذمہ داری ہے۔ اردو دوستوں کو جو عام طور پر قومی زندگی کے ہر شعبے میں اپنا رول ادا کرتے رہے ہیں، آج کے دن، جمہوریت اور سیکولرزم اور سوشلزم کے اصولوں پر عمل کے لئے اپنے کو وقف کرنے کا مزید عہد و پیمان کرنا چاہیے۔

ہمعصروں پر غالب کا اثر کی اشاعت

مکتبہ اردو۔ دلی (اردو بازار) سے ظفر ادیب کی تنقیدی و تحقیقی تصنیف "ہمعصروں پر غالب کا اثر" شائع ہو گئی ہے، اس کتاب کی ضخامت ۴۰۸ صفحے ہے اور اس کی قیمت دس روپے، گرد پوش دو رنگ اور جلد پختہ۔

• اسسٹنٹ سکریٹری

بنگلہ دیش پر ایک کتاب زیر ترتیب

جناب سجاد ظہیر صاحب کے تعاون سے بنگلہ دیش سے متعلق ایک کتاب ترتیب دی جا رہی ہے، شعرا حضرات و مضامین نگار سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تخلیقات ذیل کے پتہ پر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں۔

• دلیپ بادل، ۲۵۴۴ چراغ دلی، نئی دلی ۱۷

ایک شعری مجموعہ زیر ترتیب

"ہم ایک ہیں" کے نام سے میں ایک شعری مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں، جو عنقریب ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ جائے گا۔ شعرائے کرام قومی یکجہتی سے متعلق اپنی شعری تخلیقات مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔

• عابد مناوری

16/A گاندھی نگر۔ جمون (یوپی)

اشاعتی پروگرام

ادارہ تاج الادب نے اس سال (۱۹۷۷ء) کے اشاعتی پروگرام میں ایک ایسے سلسلے کو شامل کیا ہے جس کی ہر ایک اشاعت چار شعراء کے منتخب کلام پر مشتمل ہو گی۔ شعراء کے کلام کے ساتھ ان کی مختصر سوانح اور تصاویر بھی شامل کی جائیں گی۔

مزید تفصیلات کے لیے مہتمم ادارہ "تاج الادب" ۸۰۴۸ اردو بازار دلی ۶ کو لکھئے۔

• ناظم شعبۂ نشر و اشاعت

غالب کے کلام کا بنگالی میں ترجمہ

غالب کے اردو کلام کا بنگالی زبان میں بامحاورہ ترجمہ ہو گیا ہے جو ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا ہے۔

ملنے کا پتہ: پریت کمار نیوگی، ۱-ے-۲۷ ایچ۔ بی ٹاؤن سودے پور ۲۴ پرگنہ۔ مغربی بنگال۔

سر سید سیمینار

۱۵، ۱۶، ۱۷ رجنوری کو شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام "سر سید اور دور حاضر میں ان کی معنویت" کے عنوان سے ایک سہ روزہ سیمینار ہوا جس کا افتتاح پروفیسر مجیب نے جامعہ ملیہ سے آکر کیا۔ اس میں علی گڑھ کے اساتذہ کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر ضیا الحسن فاروقی نے بھی شرکت کی۔ اٹھارہ مقالے پڑھے گئے اور ان پر بحث ہوئی۔ سیمینار کی مختصر رپورٹ اگلی اشاعت میں دی جائے گی۔

نامہ نگار

ڈاکٹر احمد لاری

افضل مصنف "بکٹ کہانی کا وطن"

"بکٹ کہانی کا مصنف اور اس کا وطن" کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کا ایک مضمون "فکر و نظر" کے ۱۹۸۲ء کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس میں حسب ذیل تین سوالوں پر روشنی ڈالی ہے:

(۱) "بکٹ کہانی" کس کی تصنیف ہے؟

(۲) "بکٹ کہانی" کے مصنف کے نام اور تخلص کیا ہے؟

(۳) "بکٹ کہانی" کے مصنف کا وطن کونسا ہے؟

پہلے اور دوسرے سوالوں کے جواب سے مجھے مکمل اتفاق ہے لیکن تیسرے سوال کے جواب سے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ میرے خیال میں اس جواب سے افضل کے وطن سے متعلق ناموں میں ایک اور نام کا اضافہ ہوا ہے اور بس۔ اس کی بنا پر یہ گتھی کچھ اور الجھی ہے، سلجھی نہیں۔ اب تک کی معلومات کے مطابق افضل کے وطن سے متعلق حوالوں کی تفصیل یہ ہے:

نمبر شمار	نام تصنیف / تذکرہ	نام مصنف / مولف	زمانۂ تصنیف / تالیف	وطن
۱	تیرہ ماسہ (ریختہ)	اکرم رہتکی المتخلص بہ قطبی	۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰-۳۱ء	نارنول
۲	ریاض الشعرا	علی قلی خاں والہ داغستانی	۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۷ء	پانی پت
۳ (الف)	مخزن نکات (روایت اول)	قائم	۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۵ء	دیار شرق
(ب)	مخزن نکات (روایت دوم)	قائم	۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۵ء	جھنجھانہ
۴	مجمع الانتخاب	شاہ کمال	۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء	جھنجھانہ
۵	نتائج الافکار	محمد قدرت اللہ	۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء	پانی پت
۶	طبقات شعرائے ہند	کریم الدین	۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء	الہ آباد
۷	معدن الجواہر	محمد مہدی واصف	۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء	پانی پت
۸	یادگار شعرا	اسپرنگر	۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء	جھنجھانہ
۹	ترجمہ مخزن نکات	محسن علی محسن	۱۲۸۸ھ سے قبل / ۱۸۷۱ء	دیار شرق
۱۰	آفتاب عالم تاب	قاضی محمد صادق	۱۲۹۵ھ سے قبل / ۱۸۷۸ء	تھانیسر
۱۱	صبح گلشن	علی حسن خاں ابن صدیق حسن خاں	۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء	پانی پت
۱۲	سرو روشن	محمد مظفر حسین صبا گوپاموی	۱۲۹۵-۹۶ھ / ۱۸۷۸-۷۹ء	تھانیسر

گویا افضل کے وطن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل جگہوں کے نام آئے ہیں:

(۱) نارنول۔ (۲) پانی پت
(۳) جھنجھانہ۔ (۴) الہ آباد
(۵) تھانیسر

میں نے اس فہرست میں "دیار شرق" کو عمداً شامل نہیں کیا۔ جب قائم نے خود ہی اپنے تذکرے میں اصلاح کر لی ہے، تو پھر اس پر اصرار کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ اس اصلاح کی تائید صرف "مخزن نکات" کے لندن والے نسخے (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن) سے ہی نہیں ہوتی، بلکہ قائم کے شاگرد شاہ کمال کے تذکرہ "مجمع الانتخاب" اور اسپرنگر کے "یادگار شعرا" سے بھی ہوتی ہے۔ اسپرنگر نے قائم ہی کے حوالے سے افضل کا حال قلم بند کیا ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ محولہ بالا جگہوں میں سے اولین تین جگہوں کے نام اٹھارھویں صدی کی کتابوں میں آئے ہیں جو افضل کی وفات (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۵ء) کے بالترتیب ۱۰۸، ۱۲۶ اور ۱۳۲ سال بعد تصنیف ہوئیں۔ باقی دو نام پہلی دفعہ انیسویں صدی کی کتابوں میں آئے ہیں جو افضل کی وفات کے بالترتیب ۲۲۸ اور ۲۶۰ (تقریباً) سال بعد تصنیف ہوئیں۔ اس لحاظ سے افضل کے وطن کے تعین کے سلسلے میں پہلے تین نام زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ قطبی کا تیرہ ماسہ والہ کے تذکرے سے ۱۸ سال قبل اور قائم کے تذکرے سے ۲۵ سال قبل لکھا گیا۔ اگر صرف حوالے کے تقدم زمانی کی بنیاد پر افضل کے وطن کا تعین کیا جائے تو ہم یقیناً نارنول

ملہ اس دور کے مشہور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے بھی اپنے ایک مضمون "مراثی ریختہ" میں لکھا ہے کہ افضل الہ آباد کا رہنے والا تھا (تحریر دہلی، شمارہ نمبر ۱۶ ص ۶۹) لیکن موصوف نے کوئی حوالہ یا دلیل نہیں دی ہے۔

ملہ یہ ترجمہ نامکمل ہے اور مخزن نکات کے طبقہ اول اور طبقہ دوم کے شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ محسن نے صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جگہ جگہ دوسری کتابوں سے نئے مطالب کا اضافہ بھی کیا ہے' اور تذکرہ میر حسن اور تذکرہ اجا سے متعدد نئے شعرا کا حال بڑھایا ہے

(باقی کالم ۲ پر)

(باقی نوٹ کالم ایک سے آگے) علاوہ ازیں ترتیب میں بھی فرق کر دیا ہے۔ (مولانا امتیاز علی عرشی، بحوالہ تلخیص تذکرہ سراپا سخن مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین ص ۸)۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس میں افضل کا ذکر اس طرح ہے: "افضل، محمد افضل باشندہ دیار شرق ہندو بچہ گوپال نام پر عاشق ہوئے۔ اوسی عالم میں بکٹ کہانی کہی۔ اگرچہ ربط کلام اون کا چنداں مربوط نہیں لیکن قبول بے سبب در بجز خصب خامہ مالک حقیقی کا ہے۔ کلام اوس مرحوم کا مشہور و لبالب از بس ہوتا ہے۔ یہ بیت اوس مثنوی کی ہے:

پڑی ہے گل میں میرے پریم پھانسی مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
سارے جنوں نے دل لگایا اونھوں نے سب جنم رو رو گنوایا"

معلوم ہوتا ہے کہ محسن کے پیش نظر قائم کے تذکرے کی پہلی روایت رہی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ محسن نے افضل کے ترجمے میں "مخزن نکات" اور "تذکرۂ میر حسن" دونوں کے مواد کو یکجا کر دیا ہے۔

کو ترجیح دیں گے۔ لیکن تحقیق کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اس سلسلے میں خود ڈاکٹر عبدالغفار شکیل صاحب کا یہ کہنا ہے کہ تحقیق کے کاموں میں اگر کہیں شک و شبہ پیدا ہو تو وہاں میرے خیال میں حوالہ جات کے ساتھ ساتھ داخلی شواہد، خارجی شواہد اور قیاس کا تناسب علی الترتیب ۷۵، ۲۰ اور ۵ فیصد کے حساب سے ہو تو یہ مناسب بھی ہے اور معقول بھی[۱]۔ لیکن موصوف نے اس مسئلے میں خود اپنے مقولے پر عمل نہیں کیا، بلکہ محض ایک حوالے کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دیا۔

جب حوالوں میں اس قدر اختلاف رائے ہو تو داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی میں ہی کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن ہے۔ داخلی شواہد کے سلسلے میں بکٹ کہانی کی لسانی خصوصیات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں بکٹ کہانی کی زبان سے متعلق چند مشہور محققین اور ماہرین لسانیات کی آرا کا پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

پروفیسر شیرانی:

"اس کی زبان دکنی سے بہت مختلف ہے اور صاف ہے۔ اس نظم میں فارسی بندشیں اور ترکیبیں جا بجا باندھی گئی ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دکنی سے غیر حاضر ہے۔"

("پنجاب میں اردو" مکتبہ کلیاں لکھنؤ (۱۹۷۰ء) ص ۲۱۲)

پروفیسر مسعود حسین خاں:

"افضل کا تعلق والہ کی شہادت کے مطابق پانی پت سے تھا جو ہریانی علاقے میں داخل ہے، لیکن افضل کی زبان ہریانی کے اس قدر بھی لسانی اثرات نہیں رکھتی جس قدر کہ اس عہد کے دکنی مصنفین کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔"

(بکٹ کہانی (طبع ثانی - ۱۹۷۰ء) مقدمہ ص ۲۲)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی:

"زبان کے ادبی معیار اور لسانی امتزاج کے الگ الگ معیاروں سے قطع نظر دونوں کی لسانی خصوصیات قریب قریب یکساں ہیں، اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ افضل کا لسانی حلقہ بھی وہی ہے جو منشی صاحب کا ہے اور اس اعتبار سے افضل کا اصل وطن پانی پت کے بجائے جھنجھانہ ہونا چاہئے۔"

(مضمون "بکٹ کہانی مصنفہ الٰہی بخش کاندھلوی" مطبوعہ نوائے ادب "بمبئی" اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۸)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہے کہ بکٹ کہانی کی زبان ہریانی کے علاقہ سے نہیں، بلکہ کھڑی بولی کے علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں تک اس کی زبان پر برج کے اثرات کا تعلق ہے، اس کی توجیہہ کے لئے پروفیسر شیرانی کا مندرجہ ذیل اقتباس کافی ہوگا:

"اس میں شک نہیں کہ آج دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی بلکہ برج کا طوطی بول رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے۔"

("پنجاب میں اردو" ص ۱۹)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنے ایک دوسرے مضمون بعنوان "افضل اور ان کا وطن" میں "بکٹ کہانی" کی زبان کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افضل کی بکٹ کہانی میں ہندی لفظیات کا جو سلسلہ ملتا ہے وہ اس علاقہ کی بولی ٹھولی میں ہنوز رائج ہے۔ ایسے الفاظ بہت کم ہیں جو اس علاقہ کی بول چال کی زبان سے اب خارج ہو گئے ہیں۔ افعال کی بھی یہی صورت ہے جو افعال براہ راست برج کے زیر اثر ہیں ان کی صدائے بازگشت لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں میں اب بھی سنی جا سکتی ہے۔ ضمیروں میں تیں، توں، ہوں، تیہہ، مھار، تم، تجھے، مجھے کا استعمال اب بھی ہوتا ہے۔ حروف ربط میں سیتی، نے، کنے بھی سے، موں، ہینے، ہو اب بھی اس لسانی حلقہ کی بول چال کا جزو ہیں۔"

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۱۷)

یہ داخلی (لسانی) شہادت اس بات کی آئینہ دار ہے کہ افضل کا تعلق ہریانہ کے علاقہ (نارنول یا پانی پت) سے نہیں تھا، بلکہ وہ کھڑی بولی کے علاقہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ غالباً اسی چیز کے پیش نظر پروفیسر شیرانی نے والہ کی روایت نقل کرنے کے باوجود افضل کو جھنجھانہ کا باشندہ بتایا ہے:

"میرٹھ کے قریب جھنجھانہ یا جھنجھنہ ایک پرانی بستی ہے۔ عہد ماضی میں ایک مردم خیز قصبہ تھا اور بعض مشاہیر وہاں سے پیدا ہوئے ہیں

۱؎ فکر و نظر شمارہ نمبر ۲ ۱۹۸۱ء، محولہ بالا مضمون، ص ۹۵

.... محمد افضل کا شمار اسی سرزمین کے نونہالوں میں کیا جاتا ہے۔"

(پنجاب میں اردو ص ۲۰۷)

اب خارجی شواہد کی طرف آئیے۔ اس سلسلے میں تاتم کی اصلاح بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے پہلے افضل کو "از سکان دیار مشرق" لکھا تھا، لیکن اسے جب کسی ذریعے سے پتا چلا کہ افضل جھنجھانہ کا رہنے والا تھا تو اس نے "دیار مشرق" کی جگہ "قصبۂ جھنجھانہ" لکھا۔

علاوہ ازیں بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی "جھنجھانہ کے معمر لوگوں کی زبانی یہ روایت اب بھی سنی جا سکتی ہے کہ افضل جنھیں وہ بھی شاہ افضل کہتے ہیں، جھنجھانہ کے تھے اور پانی پت میں بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے۔ انھیں ایک برہمن لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو بالآخر مسلمان ہو گئی تھی اور جس سے انھوں نے شادی کر لی تھی۔"

ان داخلی اور خارجی شواہد کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ افضل کا اصل وطن جھنجھانہ تھا اور پانی پت میں ان کا قیام بسلسلۂ ملازمت تھا۔

اسرار اکبر آبادی

وطن کا پیار

(۲۶ جنوری کے موقع پر)

وطن کا دل میں پیار ہے
یہ پیار بے شمار ہے
یہ پیار بن کے روشنی، چمن چمن کی زندگی
گلوں کے رنگ جھوم لے، ہر ایک رنگ چوم لے۔
یہ سنگ دل پہاڑیاں جھکیں تو راستے کھلیں
یہ ظلمتوں کی گھاٹیاں سمٹیں تو کارواں چلیں
یہ نفرتوں کی آندھیاں
یہ آگ خون اور دھواں ہٹیں تو منزلیں ملیں
نظر نظر میں گل کھلیں

یہ وقت کی پکار ہے
وطن کا دل میں پیار ہے۔
زمیں آئینہ بنے حیات کے جمال کا
گگن پہ اک چمن کھلے جمال کے جلال کا
قدم قدم کی سختیاں،
بنیں سفر کی مستیاں یہ کام ہے کمال کا
یقین کا خیال کا

یہ عزم کا نکھار ہے
وطن کا دل میں پیار ہے۔
یہ سلسلہ بڑھے تو پھر حدوں کی ختم ہو گھٹن
جہاں ایک ہے تو پھر یہ سب جہان اک وطن
یہ فاصلے یہ دوریاں،
بنیں وفا کی بستیاں وفا کا جن میں ہو چلن
دلوں کا ہو مدھر ملن

اسی کا انتظار ہے
وطن کا دل میں پیار ہے۔

مراسلات

مکتوب تاشقند

سال گزشتہ کے آخر میں یعنی وسط نومبر سے وسط دسمبر تک سوویٹ یونین کے دوسرے علاقوں کی طرح تاشقند میں بھی سوویٹ ہندو دوستی کا مہینہ منایا گیا۔ پہلے عام طور پر دوستی کے منصوبے اس طرح کے عشرے یا مہینے اشتراکی ملکوں یا سوویٹ اشتراکی ریپبلکوں کے بارے میں منائے جاتے تھے۔ لیکن اب ہندوستان اور بعض دوسرے ایشیائی ملکوں سے دوستی کو بھی نمایاں اہمیت جا رہی ہے۔ دوستی کے اس مہینے کے دوران ٹی۔وی اور ریڈیو کے مخصوص پروگراموں کے علاوہ مختلف تہذیبی اور تعلیمی اداروں میں ہندوستان کے بارے میں جلسے ہوئے۔ اس موقع پر ہندوستان سے آنے والے کئی وفود نے بھی جلسوں میں شرکت کی۔ اور رنیشل فیکلٹی کے ڈین پروفیسر شاہ اسلام شاہ محمدوف کی تحریک پر فیکلٹی میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں کانگرس کے دو ممتاز اراکین مسٹر ہنری آسٹن اور رام لکھن یادو نے بھی شرکت کی۔ اس جلسہ میں بیشتر طلبہ اور اساتذہ نے بڑی شستہ اردو میں تقریریں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شری رام لکھن یادو نے بھی اردو سے قریب ہندوستانی میں بولنا مناسب سمجھا اور اپنی مبسوط تقریر میں اس پر زور دیا کہ ہندوستان میں وسط ایشیائی قوموں کی آمد کے نتیجہ میں گزشتہ پانچ سو سال میں جو مخلوط کلچر پیدا ہوا وہ ملک کا عزیز سرمایہ ہے۔ اسی طرح کے جلسے شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ اور ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن میں بھی ہوئے۔ انجمن کے جلسہ میں جس کی صدارت شاعرہ زلفیہ خانم کر رہی تھیں بارہ شاعروں نے ہندوستان کے بارے میں نظمیں پڑھیں۔ جن میں سے دو نظمیں "تاج محل" کے بارے میں تھیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں آگرہ پر حملے ہوئے تھے اور کسی مغربی ریڈیو کے حوالہ سے یہاں یہ افواہ گرم تھی کہ تاج محل کو نقصان پہنچا ہے۔ اسی لئے زلفیہ خانم نے آخر میں کہا کہ "ہم دعا کرتے ہیں کہ انسانی محبت اور صناعی کی یہ عظیم یادگار محفوظ رہے"۔ اسی زمانے میں تاشقند کے ہندی اسکول نمبر ۲۴ میں پنڈت نہرو کا جنم دن منایا گیا۔ جہاں نہرو دکحب میں نہرو سے متعلق کتابوں، مقالوں تصویروں اور تراشوں وغیرہ کی نمائش ہوئی اس جلسہ کی فضا عام جلسوں سے مختلف بلکہ انوکھی تھی۔ ہال کے دروازے اور اسٹیج کو گلاب کے تازہ پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ تمام طلبہ، اساتذہ اور مہمانوں کے سینے پر گلاب کا سرخ پھول نظر آتا تھا۔ ہندوستانی زبان میں کٹھ پتلی کا ایک دلچسپ کھیل دکھایا گیا۔ اور نوعمر طلبہ اور اساتذہ نے ہندوستان کے رقص اور گیت پیش کئے۔ اس رنگا رنگ پروگرام کو دیکھ کر اکثر ہندوستانی مہمان محسوس کر رہے تھے گویا وہ ہندوستان میں ہوں۔

تاشقند کے حمزہ قومی تھیٹر میں آجکل کالیداس کے ناٹک شکنتلا کے ریہرسل اپنے آخری مراحل سے گزر رہے ہیں۔ شاید آئندہ دو ماہ کے اندر اس کی نمائش شروع ہو جائے گی۔ چند ماہ قبل یہاں ایک ٹی۔وی فلم دکھایا گیا جو ٹیگور کی ایک کہانی کی بنیاد پر بنایا گیا تھا اور جس میں ہدایت کار مختار مرزا ئف نے بڑی کامیابی سے ہندوستانی (بنگال کا) ماحول پیدا کیا تھا۔ اس کی ہیروئن اسٹیج کی مشہور اداکارہ گلچہرہ تھی وہی شکنتلا میں بھی ہیروئن کا رول ادا کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ تاشقند کے تعلیمی تھیٹر میں کرشن چندر کے ناول "ایک عورت ہزار دیوانے" کی بنیاد پر ایک سنگیت ناٹک تیار ہوا ہے۔ اس کی نمائش بھی عنقریب شروع ہونے والی ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کے ڈرامے یہاں کے تھیٹروں میں پہلے بھی پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ میری خواہش اور کوشش ہے کہ "تاج کا ڈرامہ" انارکلی بھی اسٹیج ہو سکے۔

حال ہی میں ازبکی زبان میں امیر خسرو کی حیات اور کارناموں کے بارے میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو پروفیسر شاہ اسلام شاہ محمدوف اور باسط موسائف کی مشترکہ تصنیف ہے۔ اس میں ہندوستانی زبان میں امیر خسرو کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے مصنفین نے علی شیر نوائی کے تذکرہ 'مجالس النفائس' کا ایک اقتباس دیا ہے۔ اس میں نوائی نے امیر خسرو کے ایک ہندی شعر پر دلچسپ انداز سے روشنی ڈالی ہے یاد رہے کہ علی شیر نوائی کا زمانہ ۱۴۴۱ء سے ۱۵۰۱ء ہے۔ لکھتے ہیں۔

"امیر خسرو نے اپنے ہندی اشعار میں عجیب و غریب معنی پیدا کئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ معشوق ایام بہار میں کہیں جا رہا ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ زمین پر کیچڑ ہے اور وہ پھسل کر گر رہا ہے (لیکن) وہ اتنا نازک ہے کہ بارش کا تار پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب اس فقیر نے یہ معنی سے تو بہت خوش ہوا اور خسرو کو آفریں کہا۔ پھر جب کبھی بارش ہوتی تھی اور محفل جمتی تھی تو اس کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ جو خوش وقتی مجھے نصیب ہوئی وہی دوسروں کو۔ (سامعین) میری ہی طرح بے اختیار داد دیتے تھے۔" ص ۲۹

اس مضمون کا کوئی شعر مجھے امیر خسرو کے ہندی اشعار کے کسی مجموعہ میں نہیں ملا۔ تاہم اس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ امیر خسرو کا بہت سا ہندی کلام ضائع ہو گیا اور یہ کہ پندرھویں صدی تک وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بعض بیرونی ملکوں میں بھی مقبول تھا۔

علی شیر نوائی امیر خسرو کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے۔ چنانچہ انھوں نے خسرو اور نظامی کے خمسہ کی پیروی میں خود بھی ازبکی زبان میں ایک خمسہ لکھا جو ازبکی کلاسیکی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوویٹ یونین میں مجوزہ جشن خسرو کے سلسلہ میں آجکل ماسکو میں خمسۂ خسرو میں شامل مثنویوں کے متن کی صحت و طباعت کا کام باباجان غفوروف کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہاں فارسی کے بہت سے ممتاز عالم جمع ہو گئے ہیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت مناسب ہوگی 'ہماری زبان' میں شائع ہونے والا میرا پچھلا مراسلہ پڑھ کر بعض احباب کو شکایت ہوئی کہ میں نے ہندشناسی کے سلسلہ میں ماسکو کے مقابلہ میں تاشقند کو بے جا اہمیت دی ہے۔ دراصل پچھلے مراسلہ میں میں نے تاشقند کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ اردو ہندی (خاص طور پر اردو کے) سیاق سباق میں تھا۔ ہندوستان کی معیشت، سیاست، تاریخ اور ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً تامل، بنگالی اور سنسکرت وغیرہ پر بلاشبہ ماسکو اور لینن گراڈ میں زیادہ وسیع پیمانہ پر تحقیقی اور علمی کام کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ تاشقند میں اردو ہندی کی مقبولیت کے باوجود ابھی ایسے ماہرین پیدا نہیں ہو سکے جو ان زبانوں میں تحقیقی کاموں کی مناسب رہبری کر سکیں۔ ہندوستانی لسانیات اور ادب کے بیشتر ماہرین مثلاً چیلی چیف، برخوردار وف، چیرنی شوف، ذوگراف، سی چوف، سریاکوف، دشتت، اور گلیبوف وغیرہ سب ماسکو سے تعلق رکھتے ہیں اور وہی تاشقند کے اکثر علمی کارکنوں کی بھی رہبری کرتے آئے ہیں۔ ماسکو میں کتب خانوں، مشورہ اور تبادلۂ خیالات کی زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔ اس لئے یہاں کے بیشتر اسکالر ایک یا دو سال کے لئے ماسکو جاتے ہیں۔ تاہم اب تاشقند میں بھی سنجیدہ علمی کام کرنے والوں کا ایک حلقہ پیدا ہو رہا ہے جن میں سونیا چیرنیکووا، نبی محمد وف، بخش مرزا خالمرزا الیف، رحمان بیردی اور زینت اللہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب بنیادی طور پر اردو کے اسکالر ہیں۔ آئندہ قسط میں ان کے کاموں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

حال ہی میں 'سبک ہندی' کے بارے میں ممتاز شرق شناس رضائیف زین العابدینوف کی ایک وقیع کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے 'فارسی شاعری میں سولہویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی میں سبک ہندی'۔ یہ کتاب موصوف کی کئی سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ زین العابدینوف نے علمی ڈھنگ سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سولہویں صدی میں فارسی شاعری جس طرح رو بہ زوال تھی اور جو خلا پیدا ہو رہا تھا اسے پر کرنے بلکہ فارسی شاعری کو مزید فروغ دینے اور نئی راہیں دکھانے میں ہندوستان کے فارسی گو شعرا نے بہت اہم حصہ لیا۔ اگرچہ موصوف نے کتاب میں اس خیال پر بھی زور دیا ہے کہ متوسطین شعرائے فارسی کے یہاں 'وحدت الوجود' کے تصور اور مضامین نے جو مقبولیت حاصل کی اس میں ازبک شاعر علی شیر نوائی کے اثرات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نوائی پندرھویں صدی کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے وحدت الوجود کے تصورات کو ایک منضبط نظریہ کی صورت میں پیش کیا اور ازبک شاعر مشرب کے واسطے سے ان کے خیالات ہندوستان پہنچے بہرحال کتاب ہر لحاظ سے ایک دلچسپ اور سنجیدہ مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاشقند۔ • ڈاکٹر قمر رئیس

غالب کے دوسرے خود نوشت دیوان کی دریافت

میں پرانی کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں لکھنؤ گیا تھا۔ ۱۲ر جنوری گذشتہ کو جناب علامہ محسن کاکوروی رحمتہ اللہ علیہ کے مکان پر گیا۔ وہاں جناب مرحوم کے حقیقی پوتے طاہر محسن علوی خلف نور الحسن مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے عرض کیا کہ آپ کا گھرانہ علم و ادب کا مرکز رہا ہے کیا جناب کے پاس کچھ قلمی کتابیں ہیں جن کو میں خرید سکوں موصوف نے مجھے چند قلمی کتابیں دکھلائیں حسن اتفاق سے ایک دیوان غالب بخط غالب وہاں مجھ کو ملا جس کے ۳۳ اوراق کرم خوردہ ہیں کتاب کی حالت بہت زیادہ خراب ہے مخطوطہ پر سن و دن ندارد ہے" گھر آکر مرزا غالب کی تحریروں سے مقابلہ کر کے یہ اطلاع دے رہا ہوں باقی معاملہ ماہرین فن پر چھوڑتا ہوں۔

توفیق احمد قادری چشتی مالک شبلی بکڈپو امروہہ

▲

اخبار و اذکار

اردو کو یوپی میں اس کا جائز مقام دینے کا مطالبہ

لکھنؤ۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو فارسی سوسائٹی کے افتتاحیہ جلسے میں صدارت کرتے ہوئے یوپی کانگریس کی صدر مسز راجندر کماری باجپئی نے کہا کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ ان کوششوں کا بھی ذکر کیا جو ریاستی حکومت نے اردو کی ترقی اور بقا کے لئے کی ہیں۔

مسز باجپئی نے کہا کہ یہ افسوس کی بات ہے کہ جن سہولتوں کا اعلان سرکار نے کیا ہے ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محض سہولتوں کا اعلان کرنا کافی نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ جو وعدے ہوں وہ پورے بھی کئے جائیں۔

مسز باجپئی نے کہا کہ حکومت نے دس لاکھ روپیہ کے اخراجات سے ایک اردو اکیڈمی قائم کی ہے جو بڑی حد تک اردو کی ترقی کے کاموں کو پورا کرسکے گی۔ اس موقع پر طلبہ کی جانب سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس اکیڈمی میں اردو طلبہ کی بھی نمائندگی ہونا چاہیے۔ مسز باجپئی نے اس خیال سے اتفاق کیا۔

انھوں نے اردو اساتذہ کی ٹریننگ پر بھی زور دیا اور کہا کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوگا اور طلبہ کو بھی استفادہ ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت نے تمام ریاستی حکومتوں کو لکھا ہے کہ وہ اپنے یہاں اردو اساتذہ کا انتظام کریں اور اس کے لئے مرکز فنڈ مہیا کرے گا۔ صدر کانگریس نے کہا کہ حکومت اس بات کا انتظام کر رہی ہے کہ ایل۔ ٹی کے کورس میں اردو نصاب بھی شامل کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ حکومت اردو اساتذہ کی شرح تنخواہ پر بھی نظر ثانی کرے گی۔

• قومی آواز، لکھنؤ

اردو کو جائز مقام دینے کی اپیل

حیدرآباد۔ سٹی کانگریس اڈھاک کمیٹی کے نائب جناب ایس۔ سرینواس ریڈی نے بزم جوہر ادب کے زیر اہتمام سٹی کانگریس اڈھاک کمیٹی کے قائدین کے اعزاز میں منعقدہ خیر مقدمی تقریب میں حکومت سے اپیل کی کہ وہ اردو زبان کو ریاست میں اس کا جائز مقام دے۔ انھوں نے چیف منسٹر جناب پی۔ وی نرسمہا راؤ سے توقع ظاہر کی کہ چونکہ انھوں نے ابتدا ہی سے اردو زبان میں تعلیم حاصل کی ہے اور وہ اپنا مافی الضمیر اردو زبان میں بہتر طریقہ پر انجام دیتے ہیں۔ اس لئے وہ اس کا حق ادا کریں۔

جناب سرینواس ریڈی نے کہا کہ وہ ہمیشہ سے ہی اردو کو اپنی مادری زبان تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اردو کو ترقی دینے کے لئے ہمیشہ کام کریں گے۔ خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیدا ہوں۔

• سیاست حیدرآباد

کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم اور ملازمت میں اردو والوں کے لئے سہولتوں کا مطالبہ

محبوب نگر۔ انجمن ترقی اردو ضلع محبوب نگر کے زیر اہتمام غالب ہال میں اردو کارکنوں کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔

مہمان خصوصی جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیم انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ڈگری کالجس میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں قائم کرے۔ جلسہ میں ایک قرارداد پیش و منظور ہوئی، جس میں حکومت سے اردو جماعتوں کی درسی کتابوں کو جو جلانے اصطلاحات اور املائی غلطیوں کی اصلاح تلگو اور اردو کتب میں قومی یکجہتی کے مغائر مضامین کو حذف کرنے نیز مستقر اور تعلقات کے فوقانی مدارس میں سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کا انتظام مدارس فوقانیہ نسواں میں معلمات کا تقرر تعلقہ جات کے مدارس میں اردو جماعتوں کے قیام اور اردو اساتذہ کا تقرر انٹرمیڈیٹ کامیاب اردو طلبہ کو حصول ملازمت کے لئے تلگو ٹسٹ کی شرط کی برخواستگی اور تلگو میڈیم کے گریجویٹس کی طرح اردو والوں کو بھی ملازمت کا تعین اور ڈگری کالجس میں تلگو کے ساتھ اردو میڈیم کی کلاسس کا انتظام کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

• سیاست حیدرآباد

رزمیہ مشاعرہ

سنٹرل سٹی زنز کونسل نئی دہلی کی جانب سے وزیراعظم ہندوستان محترمہ اندرا گاندھی کی کوٹھی پر زیر صدارت جناب وی شنکر صاحب ایک رزمیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ وزیراعظم بنفس نفیس سوا گھنٹے تک تشریف فرما رہیں۔ مشاعرہ میں بہت سے ممتاز ممبران پارلیمنٹ کاؤنسلروں اور نامور شعرا نے شرکت فرمائی۔ شعرا نے ہندوستان کی پاکستان پر حالیہ فتح، قیام بنگلہ دیش اندرا گاندھی، شیخ مجیب الرحمٰن کے موضوعات پر جنگی نظمیں نہایت جوش اور ولولے سے سنائیں۔ جنھیں وزیراعظم اور جملہ حاضرین نے نہایت توجہ اور دلچسپی سے سماعت فرمایا۔

• گلزار علوی

اس کا سبب یہ ہے کہ جوش اپنی جگہ ایک انجمن اور ایک تاریخ ہیں، مگر اپنے عہد سے کٹ کر اس سے پیچھے رہ کر۔ اسی لئے یہ خود نوشت ادھوری، تشنہ اور یک رخی معلوم ہوتی ہے جوش نے کرداروں کا آئینہ خانہ تو سجایا ہے، مگر کسی ایسے چہرے کو آئینے کے سامنے نہیں لائے، جو اُن کا حریف ہو سکتا۔ اسی لئے ان کے بیشتر وسیع معاصرین اس نگارخانے میں نظر نہیں آتے۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع تک مروج لباسوں، کپڑوں، سواریوں، ظروف، سامان آرائش، اسباب تعیش، میلوں ٹھیلوں، تیوہاروں، عیدوں، رسموں رواجوں کو ٹھوس پیکر دینے کے لئے جوش نے الفاظ کے دریا بہا دئے ہیں۔ لیکن اپنے عہد کی ذہنی تبدیلیوں کے ذکر کے لئے ایک دو لفظ بھی بچا کر نہیں رکھے۔ جوش نے اپنی تعلیم اور شوق علم کے جو قصے لکھے ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر واقعی ان کا قدیم و جدید کا مطالعہ ایسا ہی گہرا اور وسیع تھا تو انھوں نے اپنی ادبی تخلیقات میں اس کا اظہار کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام کیوں لیا!!

جوش نے یادوں کی برات میں دوستوں کو تو یاد رکھا ہے مگر مخالفوں کو گھسنے بھی نہیں دیا۔ نیاز فتح پوری سے جوش کی لڑائی کے اسباب پر ایک زمانے میں متضاد باتیں لکھی جاتی رہی ہیں جوش نے نیاز کا کہیں نام ہی نہیں لیا حالانکہ ایک زمانے تک نیاز علی اختر کو جوش سے بہتر شاعر ثابت کرنے کی سعی ناکام میں اپنا اشہب قلم دوڑاتے رہے تھے۔ جگر بھی نجی گفتگو میں جوش کا ذکر ہمیشہ بدی سے کرتے تھے۔ ان کا ذکر نہ کر کے شاید جوش نے تعقید سے کام لیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے ڈپٹی نذیر احمد کے ایک معاملے میں جوش سے خفا ہو کر جوش کے خلاف ساقی کا ایک ضخیم نمبر شائع کیا۔ اس طرح جوش کی رسوائی تو کیا ہوتی شاہد احمد دہلوی کی کم حوصلگی نے اشتہار فرور پایا۔ جوش اس تلخی کو بھی یکسر نظر انداز کر گئے ہیں۔ البتہ شان الحق حقی اور حکومت کے بعض ارباب اقتدار کے خلاف دل کی بھڑاس اس لئے نکالی ہے کہ یہ زخم کتاب کی تحریر کے وقت تازہ تھے۔ مخالفوں پر سب و شتم نہ کر کے جوش نے اپنی عالی ظرفی تو دکھائی ہے مگر اصل واقعات کا بیان جوش کے سوانح نگار کے لئے معاون ہو سکتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جوش نے سجاد ظہیر، پروفیسر سرور، فیض، پروفیسر احتشام حسین، سردار جعفری، ہوش بلگرامی، مولوی عبدالحق، جاں نثار اختر، جذبی اور ایسے ہی کتنے ناموں کو یکسر بھلا کیسے دیا۔ ان میں سے کچھ کا ذکر آیا بھی ہے تو سرسری۔ جوش صاحب اس کا جواز شاید یہ پیش کریں کہ وہ یادوں کی برات نکال رہے تھے، انھیں پورا حق تھا کہ اس برات میں کسے مدعو کرتے اور کسے بھول جاتے۔ یہی سبب ہے کہ اس برات میں دوستوں، معشوقوں، عزیزوں کے چہرے تو چمک رہے ہیں، مگر ان کا ہم عصر ذہن اور ذہنی تبدیلیاں منہ چھپائے ہوئے ہیں۔ زندگی صرف چاہتوں کا حق ہی نہیں مانگتی، مخالف طاقتوں کے قرض کا بھی مطالبہ کرتی ہے اس کے بغیر نہ زندگی مکمل ہوتی ہے نہ شخصیت — اسی لئے "یادوں کی برات" میں دولہا تو پھولوں، گہنوں میں رچا بسا ملتا ہے اس کے آنسو اور نالے بھی چراغ بکف ہیں، مگر وہ کارواں جس کے پاؤں میں چھالے، چہرے پر سفر کی گرد اور آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی ہے کہیں بہت دور سے گزر جاتا ہے اور ہم صرف پرچھائیوں ہی کی زیارت کر سکتے ہیں۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

فغان درد

جگدیش مہتہ

نیشنل پبلیشرز ۲/۱۲ پریم نگر تلک نگر نئی دہلی ۱۸

صفحات: ۱۴۴ ، قیمت: ۳ روپے ۲۵ پیسے

جدید ہندوستان کے معمار

خلیق احمد نظامی، مترجم اصغر عباس

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی

صفحات: ۱۹۶ ، قیمت: ۵ روپے

نقد ابوالکلام

ڈاکٹر رضی الدین احمد

رجسٹرار سری وینکٹیشور یونی ورسٹی تروپتی (آندھرا)

صفحات: ۱۱۱۵ ، قیمت: ۴ روپے

اسباب بغاوت ہند

مرتب فوق کریمی

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

صفحات: ۱۴۰ ، قیمت: ۳ روپے

روپ رس

جاوید وششٹ

بک سروس ۸۰ شیا محل دہلی ۶

صفحات: ۱۸۴

قیمت: ۵ روپے

زندہ دلان حیدرآباد

۴-۲ مجرد گاہ منظور جاہی مارکٹ حیدرآباد

صفحات: ۱۶۰

قیمت: ۳ روپے

فرینک ہیرس (FRANK HARRIS) نے اپنی خود نوشت "میری حیات اور معاشقے" میں عورتوں کو مار رکھنے کے کئی سنسنی خیز واقعات لکھے ہیں، جب ان کی توثیق ان خواتین سے چاہی گئی جن کے عشق بے محابہ کا مصنف نے بیان کیا ہے تو پتہ چلا کہ مصنف آغاز شباب میں ہم کناری کے فن سے نابلد تھا اور ادھیڑ عمر میں مکمل طور پر نامرد ہو چکا تھا۔ خشونت سنگھ کا خیال ہے کہ جوش فرینک ہیرس سے کہیں بڑے فنکار ہیں، اس لئے اس سے عظیم تر دروغ گو بھی ہوں گے۔ جوش کی لذت کوشی اور جسمانی تقاضے جنھیں انھوں نے عشق کا نام دیا ہے، ان کے پورے آدمی ہونے کی دلیل یقیناً ہیں مگر ان داستانوں کے بننے میں جو نفسیاتی گرہیں (CO MPLEXES) کام کر رہی ہیں، وہ جنس کی طرف ان کے رویّے کو پوری طرح صحت مند نہیں رہنے دیتیں۔ ان کے دادا کی جنسی قوت کے محیر العقول واقعات کے بیان کو بھی جوش کے شاعرانہ طرز بیان ہی کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔

"یادوں کی برات" کے مصنف سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ آزادی کی جدوجہد کی مکمل روداد نہ سہی، ان کی طویل ادبی زندگی کے دوران ابھرنے والی ادبی تحریکوں کی دستاویز تو اس خود نوشت میں ہونی ہی چاہیے — مگر یہ توقع عبث ہے۔ جوش کے تعصبات اور شاید مروت نے بہت سے اشخاص و واقعات کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔ ان کے اہم معاصرین میں اقبال، اصغر، یگانہ، مجاز، حسرت، فراق کسی کا ذکر نہیں، ترقی پسند تحریک جس کے وہ برسوں سرخیل مانے جاتے رہے، اس کتاب میں کسی صفحے پر ایک نقش بھی نہیں چھوڑ سکی ہو سکتا ہے جوش اپنی زندگی میں ان اشخاص اور تحریکوں کو اہمیت نہ دیتے ہوں، لیکن ادب کا ایک ناقد اور مورخ جوش کو ان کے زمانے اور ہم عصر اثرات سے الگ نہیں کر سکتا۔ جوش سے قریب رہنے کا دعویٰ کرنے والوں میں اکثر کا نام تک کہیں نہیں آیا۔ شاید جوش ان کا ذکر دانستہ نہ کرنا چاہتے ہوں۔ جوش نے فراق کی تعریف میں بہت زیادہ مبالغہ کیا ہے، اور اقبال کے خلاف اپنی ذہنی گرہ کا اظہار فانی کی زبان سے ان کے تمام فلسفے کو مستعار اور ماخوذ قرار دے کر کیا ہے۔ جوش کی ادبی آرا یوں بھی قابل التفات نہیں کیونکہ ان کی زندگی اور ذہن میں جو توازن ہے، وہ ان کی شاعری اور ادبی نقطۂ نظر میں نہیں ملتا۔

سیاسی لحاظ سے جوش کی کتاب کا سب سے اہم حصہ پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے متعلق ہے یا ان کے پاکستان جانے کے بعد کے تجربات سے تعلق رکھتا ہے۔ جوش نے جس طرح پاکستانی حکام کی فرعونیت، مسلمانوں کی جاہ پرستی، دنیا طلبی اور پاکستانی معاشرے میں ادب و فن کی ناقدری کے ساتھ خود معمولی معمولی عہدے داروں کی خود نمائی کا ذکر کیا ہے، وہ غور طلب ہے۔ آج پاکستان کے موجودہ سربراہ اور ان کے رفقائے کار فوجی حکومت کی شرمناک شکست کے بعد خود اپنے طرز حکومت و معاشرت پر جو تنقیدیں کر رہے ہیں، ان سے جوش کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ جوش جو امیدیں لے کر پاکستان گئے تھے، وہ ایوب کے برسر اقتدار آنے اور ابوالطیب نقوی کے زوال کی وجہ سے پوری نہ ہو سکیں۔ بڑی کوشش کے بعد انھوں نے ترقی اردو بورڈ قائم کروایا مگر وہاں سے بھی نکالے گئے۔ انھیں اپنے شراب کے معمول کو کچھ دن ملتوی کرنا پڑا۔ اس طرح ان کی زندگی کا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ آخر میں ان کی کتاب پر پابندی عاید کر کے، اس سے مالی منفعت کی جو امیدیں انھوں نے وابستہ کی ہوں گی، ان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ ان حالات میں جوش کا اپنے وطن کو یاد کرنا، نہرو کی شرافت و عظمت کے ساتھ ہندو اور سکھ دوستوں کی انسانیت دوستی کا قصیدہ پڑھنا فطری امر ہے۔ پاکستان کی حالیہ شکست نے ترک وطن کی لغزش کا زخم اور گہرا کر دیا ہوگا۔ جوش، جو برسوں سے موت کو آواز دے رہے ہیں اور اپنے کو "مرحوم" لکھتے ہیں، احساس کی سطح پر آج بھی زندہ ہیں، اس لئے یہ حادثے ان کی خود نوشت کا اگلا ضمیمہ بن سکتے ہیں۔ خدا کرے پاکستان کی موجودہ حکومت ان کی شکایات رفع کر سکے۔

حالیہ ہند پاک جنگ کے آغاز میں پاکستان کے کسی اسٹیشن سے جوش نے ایک "رجزیہ نظم" پڑھی تھی۔ شاید وہ اس طرح اپنے دامن سے "پاکستان دشمنی" کا داغ مٹانا چاہتے تھے۔ لیکن اس نظم کی گھن گرج کے پیچھے ان کی شخصیت، سیاسی ادبی نظریے اور ایک پوری زندگی کے المیہ انجام کا نوحہ شکست صاف سنائی دے رہا تھا۔ "یادوں کی برات" بھی اسی شکست کی آواز کا مسلسل نوحہ ہے۔ اس میں عیش و طرب، لہو و لعب اور جنس و جسم نے شوخ رنگ بکھرے ہیں، پھر بھی یہ رستا نوحہ ہی ہے۔ اس جاگیرداری تہذیب کے تضادات کا جس نے جوش کو انقلاب و شباب کا شاعر بنایا تھا اور اس شاعر کا جس نے بھرپور زندگی گزارنے اور جی بھر کر شاعری کرنے کے باوجود اپنے عہد کا حق ادا نہ کیا جیسی اس سے امید تھی۔ جوش اپنی شکست میں بھی قد آور، محترم اور معزز ہیں۔

"یادوں کی برات" ایک رومان پرست شاعر کے ذہن اور زندگی کی داستان ہے۔ ہم ان سے برٹرینڈ رسل جیسے مفکر اور صاحب کردار دانشور کی گہرائی اور بلندی کی توقع ہی کیوں کریں۔ جوش کے یہاں فکر کی بلندی ڈھونڈنا یا ان کی شخصیت سے اپنے عہد کے تمام تقاضوں کو سمیٹ لینے کا تقاضا کرنا ہی غلط ہوگا۔ جوش جو کچھ اور جیسے کچھ ہیں اپنی کتاب میں ویسے ہی دکھائی دے رہے ہیں۔ اسی لئے "یادوں کی برات" کے کمزور ترین حصے بھی ان کی شخصیت اور زندگی کی ترجمانی میں سچے ہیں — اور یہی اس کتاب کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ جوش نے اپنی شخصیت کو مبالغوں کا ہالا بنانے کے باوجود تمام تر انسانی کمزوریوں کے ساتھ پیش کر کے خود نوشت کا حق ادا کیا ہے۔ یہ مجبوری ہے، ان کی شخصیت کی کہ ان کی خود نوشت ایک پورے عہد کی سیاسی، ادبی اور فکری کشمکش کی داستان نہیں بن سکی۔

(باقی صفحہ ۵ پر)

آئے۔ اس کے کچھ حصے بھی بعض رسائل میں شائع ہوئے جو ہندوستان کے لئے سیاسی معنویت رکھتے تھے۔

پوری کتاب پڑھنے کا موقع مجھے ایک ماہ قبل ملا۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ جوش کی طرح ان کی خود نوشت کے متعلق انتہاپسندانہ آرا تعصبات پر مبنی ہیں۔ کتاب دلچسپ ہے، جاندار ہے اور شاید پچاس فی صد معتبر اور سچی بھی ہے۔ جوش کی نثر کا اسلوب بہت پرانا اور ایک حد تک مصنوعی ہوتا ہے۔ نثر بھی شاعری کی طرح، ان کے لئے الفاظ کا ایک ذخیرہ ہے۔ لیکن اس کتاب میں، جہاں جوش نے اپنے تجربات کے بیان میں لفاظی اور تصنع سے کام نہیں لیا، نثر رواں بھی ہے اور جاندار بھی۔ خصوصاً اس کے وہ حصے جو شخصیات کے متعلق ہیں، اردو شخصیت نگاری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک فحش لطائف، عریاں نگاری، جنسی تجربات اور لذت کوشی کی ترجمانی کا سوال ہے شاید جوش سے زیادہ اردو میں کوئی دوسرا ان کا ایسا حق ادا بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ نہ تو دوسروں کے تجربات ایسے متنوع ہوں گے، نہ زبان ان معاملات کے بیان میں ایسی یاوری کر سکتی ہے جیسی جوش کی شخصیت اور زبان نے کی ہے۔ جوش کو اہل اردو سے مردانگی کی کمی کی شکایت ہے، اسی لئے وہ بہت سی باتوں کو 'ناگفتنی' چھوڑ گئے ہیں جن کا انھیں قلق ہے مگر جتنا کچھ ان کے قلم نے 'گفتنی' بنا ہے ادبی شاید ہماری تہذیب کی ریاکاری اور نقاب در نقاب طرز بیان کے لئے مشکل ہی سے قابل قبول ہوگا۔ اس سلسلے میں رفیع احمد خاں، قاضی خورشید، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا عبدالسلام، وحیدالدین سلیم اور بعض دوسروں کے خاکے اپنے لطائف کے ساتھ بہت پر لطف بھی ہیں اور جاندار بھی۔ نجی گفتگو اور بے تکلف محفلوں میں فحشیات، اور جنسیات میں بڑے بڑے شیوخ و زہاد، ثقہ اور متعلق حضرات مریضانہ حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن ان کا اس طرح بیان شاید کم ہی لوگوں کے حلق سے نیچے اترے۔ جوش اس لحاظ سے اپنے ہم عصروں ہی میں نہیں، بلکہ بعد والوں کے مقابلے میں بھی جو آدھے یا پاؤ ظاہر ہوتے ہیں، اور اس کے علاوہ کچھ ہیں تو زیر نقاب ہی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، یقیناً پورے آدمی ہیں۔ یہی حصے اس کتاب کا حاصل ہیں، کیونکہ انھیں جوش کے علاوہ دوسرا لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید فراق بھی نہیں لکھ سکتے۔ فراق کے تجربات و لطائف ایسے ہی ہیں، مگر جوش کی زبان وہ کہاں سے لائیں گے۔

'یادوں کی برات' کی اہمیت یہ ہے کہ یہ پوری ایک تہذیب اور اس کے زوال کی رنگین و روشن داستان پیش کرتی ہے۔ جاگیردارانہ تہذیب اپنی ساری خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ جوش کو اس کے سطحی پہلو سے زیادہ دلچسپی رہی ہے اور وہی انھوں نے دکھایا بھی ہے۔ اور اپنی انقلاب پسندی کے باوجود وہ اس سے اب بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ جوش کو اپنی امارت و ثروت کی خاندانی روایات ہمیشہ عزیز رہیں، اپنے خاندان اور بزرگوں کے ذکر میں انھوں نے اسے بہت بڑا (ENLARGE) کر کے دکھایا ہے۔ اپنے پردادا، دادا، باپ، چچا وغیرہ کو یوں پیش کیا ہے گویا وہ زمیندار نہیں بادشاہ تھے۔ جوش کے خاندان سے واقفیت رکھنے والے ان کے بہت سے بیانات کو مبالغے پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح حیدرآباد ایسی ریاست میں، جو ملک کا درجہ رکھتی تھی، نظام حیدرآباد ایسے مطلق العنان، خود پرست اور متلون مزاج بادشاہ سے اپنے تعلق خصوصی اور رنجش و خود سری کے جو واقعات انھوں نے لکھے ہیں، وہ بھی معروضی تنقید کے سامنے زیادہ معتبر نہیں ٹھہریں گے۔

جہاں تک جوش کی اپنی فطری معصومیت، معاش سے بے نیازی، اور لاپرواہی کا معاملہ ہے، شاید بہت سے لوگ ان کی توثیق کریں۔ جوش ہمیشہ خوشحال رہے، فراغت کی زندگی گزاری، ان پر تنگی کے زمانے گزرے بھی تو بہت سرسری اور پران و گزراں۔ ان کے مزاج میں جائداد اور دولت سے محبت کو شاید کبھی دخل نہ رہا ہو۔ اپنے متعلقین کی زندگی اور مستقبل کے نام پر جائداد اور خوشحالی کے وعدوں کے سہارے، انھوں نے جس طرح ہندوستان کی اپنی باوقار، خوشحال، معزز اور آرام دہ زندگی چھوڑی، اس سے ایک حد تک طمع دنیا تو ظاہر ہوتی ہے، مگر اس دولت کوشی کی تہہ میں بھی عقل معاش کی حیرت ناک کمی اور سیاسی معصومیت کارفرما نظر آتی ہے۔ جوش کی شخصیت کا یہ پہلو تضادات کا حامل ہے ایک طرف وہ راجوں، نوابوں، امیروں اور وزیروں کے ممنون کرم ہوتے بھی ہیں تو اس طرح جیسے اپنی شاعری کا خراج وصول کر رہے ہوں۔ دوسری طرف انھوں نے اپنی ذاتی جائداد کا بڑا حصہ حاصل کرنے یا باقی رکھنے کی کوئی سعی نہ کی۔ اس پر دوسرے قابض و متصرف رہے، دوچیوں ہی میں خرد برد نہیں کیا، انھیں جائداد سے محروم بھی کر دیا، مگر انھوں نے مروت اور وضعداری کا دامن نہ چھوڑا۔ وہ اپنے دوستوں کی مدد اور سفارش میں ہمیشہ سرگرم رہے، اس معاملے میں ان کا حد سے زیادہ خلوص ان کے لئے مضر بھی ہوا، کبھی کبھی لطیفہ بھی بنا۔ یہ ان کی لگے وقتوں کی سی شرافت کا ثبوت ہے۔ جوش کی شخصیت کا یہی پہلو سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔

'یادوں کی برات' کا بدترین حصہ ان کی حیات معاشقہ کی داستانوں پر مشتمل ہے، اگر یہ ضمیمہ شامل نہ ہوتا تو کتاب پر لغویت کا وہ گمان نہ گزرتا جو کچھ اصحاب نظر کو ہوا۔ اس حصے میں جوش نے امرد پرستی سے آغاز کر کے ہر طرح کے ناقابل یقین واقعات کا بالا اپنے اطراف یوں بنا ہے کہ اس سے روشن ہونے کے بجائے ان کا چہرہ دھندلا جاتا ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی میں خشونت سنگھ نے جوش کی ان داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے دلچسپ بات لکھی ہے کہ

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر)

وحید اختر

میرا صفحہ

یادوں کی برات

جوش ملیح آبادی — اردو ادب میں محض ایک نام نہیں، ایک روایت ہے۔ بہت کم افراد اپنی ذات سے انجمن یا ادارہ کہلائے جانے کے جوش کی طرح مستحق ہیں۔ جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے مشہور ہوئے، مگر ان کی شاعری شبابیات اور رومانیت کے گرد ہی گھومتی رہی، ان کا انقلاب بھی صرف ایک رومانی تصور ہے، جس کے پیچھے نہ تو کوئی گہرا سماجی، سیاسی شعور تھا، نہ وہ شاعرانہ بصیرت جو شاعری کو جزو پیغمبری بنا دیتی ہے۔ جوش کا آرٹ لفظوں کی چمک دمک، شکوہ و جلالت اور جذبے کی تندی و تیزی کا اظہار ہے۔ اگر ان کے یہاں فکر کا عنصر کہیں گہرائی حاصل کرتا ہے تو ان کی رباعیات میں — رباعی میں وہ بلاشبہ اردو کے بہترین شاعر تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری کا بہترین حصہ یا تو طنزیہ ہے یا جذبات شباب کی بدن گشا مستی کا عکاس — جوش کے متعلق دو انتہا پسندانہ رائیں آج بھی مل جائیں گی۔ ایک تو انھیں شاعر اعظم ماننے منوانے پر مصر ہوگی اور اس رائے میں فراق بھی شامل ہیں، جن کے ایک مجموعے کا انتساب اس کا شاہد ہے، بشرطیکہ جوش کی ہجرت اور دگیان بھون انعام کے بعد فراق کو اپنی عظمت منوانے کے شوق نے اس رائے سے پھیر نہ دیا ہو۔ ترقی پسند شعرا بھی انھیں برسوں اپنا امام اور سر حلقۂ رندان مانتے رہے۔ دوسری رائے کے مطابق جوش ایک معمولی درجے کے شاعر ہیں، جو اقبال کی ہم سری کے اپنے تمام تر دعاوی کے باوجود اردو شاعری میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتے۔ اب ترقی پسندوں میں بھی جوش کا پرانا تصور ختم ہو چکا ہے — یہ دونوں متضاد رائیں جوش کی شاعری کو اردو کی شعری روایت اور جدید تجربات کے تناظر میں نہ دیکھنے کا نتیجہ ہیں۔ جوش کی شاعری فکری لحاظ سے وقیع نہیں، ان کی نظمیں ایڈیٹنگ کی محتاج ہوتی ہیں، وہ لفظوں کے جادوگر ہیں مگر بقول مجاز ڈکشن کے نہیں ڈکشنری کے شاعر ہیں، ان کی سیاسی خطیبانہ نظمیں بلند آہنگ سطحی نعروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، مذہب اور ملائیت کے خلاف ان کا جہاد بھی کسی گہری ذہنی بغاوت کا حامل نہیں۔ اس کے باوجود جوش بیسویں صدی کے اہم ترین شعرا میں سے ایک ہیں، اقبال کے بعد اپنے اثر کے لحاظ سے وہ سب سے ممتاز ہیں۔ ان کا قد، اپنی کوتاہیوں کے بعد بھی، جدید نظم کے بہترین شاعروں سے کسی طرح کم نہیں، جوش کو اگر تاریخی تناظر اور ان کے اثر کی ہمہ گیری کی روشنی میں دیکھا جائے، اور اس مقبولیت و محبوبیت کو نظر انداز نہ کیا جائے جو انھیں برسوں حاصل رہی تو ان کی بڑائی کا اعتراف ان کے کٹر مخالفین کو بھی کرنا ہی پڑے گا۔ جوش اگر عظیم نہیں تو معمولی بھی نہیں — وہ اردو کے ایک وقیع شاعر ہیں جنھوں نے نظم کے ارتقا میں اقبال کے بعد تمام پچھلے نظم گویوں سے زیادہ گہرا اثر چھوڑا ہے۔

پاکستان کو ہجرت کر جانے کے بعد جوش کی اس سیاسی لغزش نے ان کی شخصیت کو سرحد کے دونوں طرف نقصان پہنچایا۔ ہندوستان میں ان سے جس آزادی، بے باکی اور شاعرانہ سرکشی کی روایت وابستہ ہو گئی تھی اس کا طلسم ٹوٹ گیا۔ پاکستان میں بطور مہمان ان کی جو آؤ بھگت ہوتی تھی، وہ معاندانہ رویے میں بدل گئی، یہی نہیں ان کو عموماً پاکستان کے شعرا میں حفیظ جالندھری سے کم حیثیت دی جانے لگی — اب اتنی بھی کیا خاکساری! جوش ایسے بھی کمزور شاعر نہ تھے! یہ جوش کے سیاسی اور ادبی نظریات کے خلاف تعصب کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان میں ان کے خلاف تعصب خود ان کے اس عمل نے مضبوط کیا۔ اور ان کے مداحوں سیاسی سرپرستوں، اور عاشقوں کو، جن میں نہرو اور ابو الکلام ایسی شخصیتیں شامل تھیں، یہی کہنا پڑا ہوگا —

> ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
> تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

پچھلے برس کراچی سے جوش کی خود نوشت "یادوں کی برات" ایسے وقت شائع ہوئی جبکہ ہندوستان پاکستان کے درمیان کتابوں اور رسالوں کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ اس کتاب کا لاکھوں کو ہندوستان میں انتظار تھا اور اب بھی ہے۔ پاکستان میں اس کتاب پر ہندوستان دوستی کے الزام میں یحییٰ خان کی فوجی حکومت نے پابندی لگا دی۔ ایک صاحب نے ان پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اور اس طرح جوش کی زندگی کے تجربات کو براہ راست جوش ہی کے قلم سے جاننے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ ہمارے ملک میں اس خود نوشت کی چند جلدیں کسی طرح پہونچ گئیں — اس کتاب کو ہر شخص، خواہ وہ جوش کا مداح ہو یا مخالف، پڑھنے کا شائق ہے۔ پابندی نے اس کتاب کی قدر و قیمت اور بھی بڑھا دی۔

کوئی چھ ماہ قبل اردو کے ایک معتدر شاعر اور ناقد نے یادوں کی برات کے متعلق یہ رائے دی کہ "اس سے زیادہ لغو کتاب میں نے شاید ہی پڑھی ہو — مگر اردو الفاظ کے ذخیرے سے واقفیت حاصل کرنا ہو تو یادوں کی برات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔" جوش کی حیدرآباد کی زندگی کے واقعات کے خلاف ایک دو تبصرے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)، پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔